© rasailojaraid.com

توشی هیکو ازتسو

اچھے اور برے کے لیے قرآنی الفاظ

(ترجمہ محمد خالد مسعود)

حمیت و عصبیت

[۵۵] اب ہم قبائلیت کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ عام طور پر معلوم ہے کہ قبل از اسلام عرب کی معاشرت اپنی اصل میں قبائلی تھی۔ اکثر مصنّفین لکھتے ہیں کہ قبیلے کے افراد میں ایک دوسرے کے ساتھ یکجہتی کا جذبہ ہی دراصل جاہلی اخلاقیات کی روح رواں تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب معاشرے میں قبیلہ یا بطن معاشرتی زندگی کی بنیاد اور وحید اکائی ہی نہیں تھا بلکہ یہ سب سے پہلا اور سب سے اعلیٰ اخلاقی اصول بھی تھا جو انفرادی اور کلی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ایک جامع طرز عمل مہیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی جاہلی حمیت سے تمام اخلاقی تصورات کے سوتے پھوٹتے تھے جن پر عرب معاشرت قائم تھی۔ معاشرے کے ہر مرد یا بالفاظ دیگر گروہ کے ہر انفرادی رکن پر یہ مقدس فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کی عظمت کے لیے جیئے اور خونی رشتوں کے بندھن کی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزت کرے۔

قبائلی رشتے کے اس احساس کی گہرائی اور غیر عقلی نوعیت کا اظہار درید بن صمہ کے مندرجہ ذیل شعر سے زیادہ واضح کہیں نہیں ملتا' وہ کہتا ہے:

وما انا الا فی غزیه ان غوت
غویت و ان ترشد غزیه ارشد(۱)

(۱) کتاب الحماسته للبحتری' بیروت' المکتب الشرقی' ت۔ن' ص ۸۷ (الباب السابع والاربعون) مصنف نے نکلسن' ادبی تاریخ عرب (انگریزی) (کیمبرج' ۱۹۵۶ء) ص ۸۳ کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''میں غزیہ سے تعلق رکھتا ہوں' اگر غزیہ غلطی کرتا ہے تو میں بھی غلطی کروں گا۔
اگر غزیہ صحیح ہے تو میں بھی صحیح ہوں۔''

اس شعر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ قبائلی عصبیت جاہلی عرب کے اعمال کا رخ کس طرح متعین کرتی تھی اور قبائلیت کے احکام کی خواہ وہ غلط ہوں یا صحیح کس طرح پابندی ضروری تھی۔ [۵٦] رائن ہارٹ ڈوزی لکھتا ہے: ''یہ لازوال اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ جسے عصبیت کہا جاتا ہے ہر جاہلی عرب اپنے ہم قبیلہ کے لیے محسوس کرتا تھا۔ اپنی اس معاشرت کے لیے جس میں ایک جاہلی عرب پیدا ہوا' زندگی گزاری اور جہاں اسے موت آئے گی' اس کے مفادات' خوشحالی' شان اور عزت کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دینا' عصبیت کہلاتا تھا۔ یہ جذبہ کسی طرح بھی ہمارے آج کل کے حب وطن کے رویے سے مماثلت نہیں رکھتا جو کہ ایک تند خو بدو کے لیے بہت ہی نرم جذبہ ہے۔ عصبیت ایک شدید اور انتہائی جذبہ ہے۔ یہ ایسا فریضہ ہے جو بیک وقت سب سے اول اور سب سے مقدس ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ''صحرا کا اصل دین یہی ہے۔''[(۱)] اگر اس بیان کو مبالغہ آمیز بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ عصبیت صحرا کے جاہلی مذہب سے زیادہ مضبوط اور موثر جذبہ تھا۔ جاہلی مذہب ابتدائی درجے کے ایسے مذہب سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا جس میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانا جاتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کی آمد کے زمانے تک اس میں مزید زوال آ چکا تھا اور یہ اب سحر اور جادو کی ایک شکل بن کر رہ گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر بعض اوقات دوسرے اخلاقی قوانین کی طرح قبائلی عصبیت کے اس قانون کی بھی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ صحرا کی دنیا میں بھی کبھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہو جاتے تھے' جن کی انفرادیت اتنی شدید اور منہ زور ہوتی تھی کہ وہ قبائلی مفاد کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسا شخص فطری طور پر اپنے خطرناک کاموں کی وجہ سے قبیلے کے اندر اور باہر فساد

(۱) رائن ہارٹ ڈوزی' تاریخ مسلمانان سپانیہ (فرانسیسی) (لیڈن' ۱۹۳۲ء) جلد اول' ص ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا باعث بنتا تھا۔ وہ بعض اوقات اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے ہم قبیلہ لوگوں کو بھی نہایت خونریز جنگوں میں ملوث کر لیتا تھا۔ کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کے شرمناک کاموں کی ذمہ داری اس کے پورے قبیلے یا بطن پر عائد ہو جاتی تھی۔ ایسی صورت حال میں اس کی ہر قسم کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہونے کے لیے قبیلے کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا تھا کہ اس شخص کو رسمی طور پر قبیلے سے باہر نکال دے۔ اس طرح نکالے ہوئے شخص کو خلیع کہا جاتا تھا۔ اس کاروائی کو تبرء[1] کا نام دیا جاتا تھا۔ اس طرح کے قبیلے سے نکالے ہوئے بے گھر افراد صعالیک (واحد صعلوک) کہلاتے تھے۔ جو زمانۂ جاہلیت میں صحرا میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان میں سے بعض کی حالت بے حد ناگفتہ بہ ہوتی تھی جبکہ دوسرے عزت و وقار کے ساتھ رہتے تھے اور انھیں آزادی اور خود مختاری کی مجسم علامت سمجھا جاتا تھا۔

عروہ بن الورد العبسی کی ایک نظم ایک ایسی ہی آوارہ طرز زندگی کا گیت ہے۔ وہ خود عرب صعالیک کی تاریخ کی ایک نمایاں شخصیت تھا۔ اپنی اس نظم میں اس نے بھی ان دو قسموں کے صعالیک کا ذکر کیا ہے، جن کا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔

[۵۷] لحا الله صعلوکا اذا جن لیله
مصافی المشاش آلفا کل مجزر

"اللہ کی لعنت ہو اس بے گھر آوارہ پر کہ جب رات آتی ہے تو وہ اندھیرے میں مذبح خانوں میں ہڈیوں کے سر تلاش کرتا پھرتا ہے۔"

ینام عشاء ثم یصبح ناعسا
یحت العصا عن جنبه المتعفر

(۱) تبرء، یا تبرا کا مطلب خود کو کسی دوسری شے یا کسی دوسرے کے فعل سے بری قرار دینا ہے۔ بری کا مطلب ہے، کسی ناپسندیدہ چیز سے مکمل طور پر آزاد ہونا، اس چیز سے کوئی واسطہ نہ ہونا۔ نہایت دلچسپ بات ہے کہ یہ قدیم لفظ جو جاہلی معاشتی زندگی سے مخصوص تھا، بعد میں اسلامی دور میں علم الکلام کی اصطلاح بن گیا جس کا مطلب ہے مسلم آبادی سے خارج کر دینا۔ اسلام کے اولین متکلمین خوارج نے اس تصور کو بہت غلط معنوں میں استعمال کیا، انہوں نے مسلمانوں کی اکثریت سے اپنے کو بری الذمہ قرار دیا یعنی اپنے علاوہ دوسروں کو کافر قرار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"رات گئے تھک کر سو جاتا ہے، صبح اٹھتا ہے تو ابھی تھکاوٹ نہیں اتری ہوتی۔ اپنے پہلوؤں سے جو مٹی سے بھرے ہوتے ہیں، گرد جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔"

ولكن صعلوكا صفحه وجهه
كضوء شهاب القابس المتنور

"لیکن سچا صعلوک وہ ہے جس کا چہرہ اندھیرے میں دائیں سے بائیں کسی شہاب ثاقب کی طرح دمکتا ہو۔"

مطلا على اعدائه يزجرونه
بساحتهم زجر المنيح المشهر

"وہ پڑوس سے اچانک نمودار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور دشمن اس کو گھروں سے اس طرح ہٹاتے ہیں جیسے قمار کے تیر کو جس کا حصہ نہیں ہوتا۔"

اذا بعدوا لايامنون اقترابه
تشوف اهل القائب المنتظر[۱]

"دشمن اس سے دور بھی ہوں تو اس کے آ جانے سے ڈرتے رہتے ہیں، جس طرح مسافر کے گھر والے انتظار کرتے ہیں۔"

شعرا کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے عقل و حکمت زندگی کے عملی تجربات سے سیکھی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ ایک نازح (آوارہ اجنبی) اس قریبی رشتہ دار سے زیادہ اچھا دوست ہے جس نے رشتے منقطع کر لیے ہوں۔[۲]

بہرکیف یہ تمام مثالیں استثنائی ہیں اور تعداد میں بہت کم ہیں۔ صحرائی ماحول میں ان بے گھر لوگوں کی زندگی اور موت میں خواہ وہ فطری ہو یا انسانی دشمن کے ہاتھوں، بہت کم فاصلہ ہوتا تھا۔ کیونکہ صحرا کی موسمی اور سماجی صورتحال میں زندہ رہنا بہت دشوار تھا۔ اس کے لیے

(۱) ابو تمام، حماسہ (بولاق، ۱۲۹۶ھ)، جلد اول ص ۲۱۹-۲۲۰

(۲) قديوصل النازح (النائى) وقد يقطع ذوالسهمه القريب

(دیوان عبید بن الابرص، بحوالہ بالا، ص ۸، مترجم)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت اعلیٰ درجے کی قبائلی یکجہتی ہونا ضروری تھی۔ اگر کسی قبیلے میں باہر کے لوگوں کو شامل بھی کر لیا جاتا تھا اور وہ قبیلے سے نکالے ہوئے لوگوں سے بہتر زندگی بھی گذار رہے ہوتے تھے۔ لیکن ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی کیونکہ وہ بہرکیف قبیلے سے باہر کے لوگ تھے۔ قبیلے میں اس طرح شامل لوگوں کو زنیم کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بے حد اہم ہے کہ اس لفظ کے ثانوی معنی 'نیچ' بدکردار یا بے حیثیت لیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جہاں قرآن کریم کی اس آیت کا ذکر کرتے ہیں جس میں لفظ زنیم استعمال ہوا ہے[1] ابن اسحاق وہاں اس بات کی وضاحت ضروری محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں زنیم کا لفظ کسی نسبی عیب کے بیان کرنے کے لیے نہیں آیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے نسب پر نکتہ چینی نہیں کرتا بلکہ آیت کریمہ میں یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں آیا ہے یعنی ایسا اجنبی شخص جو کسی قبیلے نے اپنے میں شامل کر لیا ہو۔[2] ایک جاہلی شاعر الخطیم التمیمی کہتا ہے: کہ قبیلے کی زندگی میں زنیم کو ایک بیکار اور فالتو شخص کا اضافہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس اضافے کو اپنے خونی رشتہ داروں پر ترجیح دینے کی جرأت کرتا تو اسے
[۵۸] ملامتوں کے طوفان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعینہٖ یہی وجہ تھی کہ مدینہ کے جن عرب قبیلوں نے حضرت محمد ﷺ کی حمایت کی تھی' انہیں بے انتہا مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نفرت کا اظہار عصما بنت مروان کے مندرجہ ذیل اشعار میں بہت کھل کے ملتا ہے۔

باست بنی مالک والنبیت

و عوف و باست بنی الخزرج

"بنی مالک' بنی نبیت اور بنو عوف میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں اور بنو خزرج میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔"

---

(۱) مناع للخیر معتد اثیم عتل بعد ذلک زینم (القلم: ۱۲-۱۳)' ترجمہ: مال میں بخل کرنے والا' حد سے بڑھا ہوا بدکار' سخت خو اور اس کے علاوہ بدذات بھی۔

(۲) ابن ہشام: سیرۃ النبی (قاہرہ: دار الفکر ۱۹۸۱ء) تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید' جلد اول' ص ۳۸۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اطعتم اتاوتی من غیرکم
فلا من مراد ولا مذحج[۱]

"تم نے ایک باہر سے آئے اجنبی کی اطاعت کرلی جو نہ مراد کے قبیلے سے ہے نہ مذحج کے۔"

زمانۂ جاہلیت کا سماجی نظام اپنی اصل میں قبائلی تھا۔ ان کے لیے انسانی وجود کا حرف اول اور حرف آخر قبیلہ تھا۔ نسبی رشتوں کے بندھن، عزت و آبرو کا شدید جذبہ سب خونی رشتوں کی اہمیت پر مبنی تھے اور جس کا یہ تقاضا تھا کہ انسان غلط یا صحیح اپنے ہم قبیلہ بھائیوں کا ساتھ دے، اپنے قبیلے سے محبت رکھے اور باہر کے لوگوں سے شدید حقارت کا برتاؤ کرے۔ یہی وہ چند اصول تھے، جن کی بنیاد پر زمانۂ جاہلیت کے لوگ ذاتی قدروں کو ناپتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں قبیلے سے باہر اچھائی کا کوئی معیار دکھائی نہیں دیتا۔

حضرت محمد ﷺ نے جو مذہبی تحریک شروع کی، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ نے اس صورت حال میں جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں، یہ اعلان کیا کہ خون کے رشتوں سے بڑھ کر مذہب کے رشتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنا جس کی اساس خدائے واحد کے عقیدے پر ہو یقیناً ایک جرأت مندانہ کوشش تھی۔ پروفیسر گستاف فون گرونیبا[۲] کے الفاظ میں اس معاشرے میں لوگ خون کے نہیں عقیدے کے رشتہ دار تھے۔ اسی پروفیسر کے بقول حضرت محمد ﷺ کے پیغام میں مذہبی سچائی کے علاوہ جو چیز لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتی تھی، وہ درحقیقت ایک نئی معاشرتی سیاسی اکائی بننے کی واضح اہلیت رکھتی تھی۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کو بے شمار مشکلات سے گزرنا پڑا۔ حضرت محمد ﷺ کے جانی دشمن ابوجہل کی نظر میں حضرت محمد ﷺ ایسے شخص تھے جس نے سب سے زیادہ خون کے رشتوں کو توڑا اور ناقابل معافی چیزوں کو رواج دیا۔ قریش مکہ کے شاعر حارث بن

(۱) سیرۃ ابن ہشام، جلد ۴، ص ۳۴

(۲) جی ای فان گرونے بام: اسلام: ایک ثقافتی روایت کی نوعیت اور فروغ پر مضامین (انگریزی) نیویارک، ۱۹۶۱ء، ص ۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہشام نے جنگ بدر کے بعد ان لوگوں کی شان میں قصیدہ لکھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔[1]

[۵۹]

اصیبوا کراما لم یبیعوا عشیرۃ
بقوم سواھم نازحی الدار والاصل
کما اصبحت غسان فیکم بطانه
لکم بدلا منا فیالک من فعل
عقوقا واثما بینا وقطیعه
یری جورکم فیھا نووالرأی والعقل

''وہ عزت مند بہادروں کی طرح مارے گئے۔ انہوں نے اپنے خاندان کو ایسی قوم کے بدلے میں نہیں بیچا جو اجنبی ہیں' نہ گھر میں ایک ہیں نہ اصل میں۔ جب ہماری (قریش کی) جگہ تم نے غسان کو سچا دوست بنا لیا تو تم خاندان فروش بن گئے۔ تم سے یہ کیسا فعل سرزد ہوا۔ تم نے غداری کی ہے' کھلا جرم کیا۔ رشتے توڑ دیئے' ہر صاحب رائے اور صاحب عقل اس فعل میں تمہارے ظلم اور ناانصافی کو دیکھ رہا ہے۔''

یہ بات یاد رہے کہ سیاسی طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قبائلی عصبیت کے موجود اصول سے بہت فائدہ اٹھایا۔ حتیٰ کہ شہر مکہ میں خصوصاً عہد نبوت کے ابتدائی سالوں میں اسی عصبیت نے آپ کو فائدہ بھی پہنچایا۔ پروفیسر منٹگمری واٹ نے لکھا ہے[2] کہ یہ بنو ھاشم کا جو کہ قبیلہ قریش کی ایک طاقتور شاخ تھی عصبیت کا جذبہ تھا جس نے ہر قدم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی اور قریش کے سرکردہ لوگوں کی نفرت اور مخالفت کے باوجود پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں تبلیغ کا کام سرانجام دے سکے۔ روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) ابن ہشام' جلد ۲' ص ۳۷۴

(۲) پروفیسر منٹگمری واٹ: محمد مکہ میں (آکسفورڈ' ۱۹۵۳ء)' ص ۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاشم کے پوتوں کے خاندان سے تعلق کی وجہ سے مکہ کے اس عظیم الشان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

تاہم اس کے باوجود حضرت محمد ﷺ نے قبائلی عصبیت کے اس اصول کو ختم کر کے عقیدۂ توحید کی بنیاد پر معاشرت کی نئی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اسی دنیا میں ایک ابدی نظام قائم کرنے کے لیے نئے قواعد و ضوابط پر مبنی زندگی کا اعلان کیا۔ اس تبدیلی کو بجا طور پر انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ انقلاب پہلے پہل خالصتاً مذہبی بنیادوں پر برپا ہوا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس مذہبی رشتے پر بتدریج سیاسی رنگ غالب آتا گیا۔

بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے عقیدے کی بنیاد پر ایک نئی قسم کے بھائی چارے کا آغاز کیا جس میں تمام افراد ہم عقیدہ تھے اور ان میں خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط رشتہ اس عقیدے کا تھا۔ اس کتاب کے مقصد کے پیش نظر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ عصبیت کے اس پرانے نظام کا خاتمہ دراصل آخرت کے خوف کے تصور پر مبنی ہے کیونکہ اس روز خون کے تمام رشتے جن کی آج اتنی اہمیت ہے بالکل بے معنی اور بے وقعت ہو جائیں گے۔

فاذا جاء ت الصاخة یوم یفر المرء من اخیه وامه وابیه وصاحبته وبنیه لکل امری منهم یومئذ شان یغنیه (عبس:۳۳-۳۷)

"اور جب (قیامت کا) شور برپا ہو گا' اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور باپ سے' اپنی بیوی اور بیٹے سے' ہر شخص اس روز اپنی فکر میں ہو گا جو اسے دوسروں سے بے تعلق کر دے گی۔"

لاتجد قوما یومنون بالله والیوم الآخر یوادون من حاد [۲۰]
الله ورسوله ولو کان آباء هم او ابناء هم او اخوانهم او

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عشیرتھم (الحشر:۲۲)

"جو لوگ خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تم انہیں خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے نہ پاؤ گے' خواہ وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا خاندان کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔"

ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفر واللمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ماتبین لھم انھم اصحب الجحیم وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ (التوبہ: ۱۱۳-۱۱۴)

"پیغمبر اور مسلمانوں کے شایان شان نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش مانگیں خواہ وہ ان کے رشتے دار ہی ہوں جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اہل دوزخ ہیں۔ ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے۔ لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بری[1] ہو گئے۔"

اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ انفرادیت کے اصول کا کھلا اعلان ہے۔ قیامت کے دن لوگ انفرادی طور پر خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہو گا۔ اور یہ صورت حال ہر شخص کے لیے اس کی موت کے لمحے سے شروع ہو جاتی ہے۔ عمرو بن عبید کا قول تھا: "اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ تم اکیلے مرو گے۔ تمہیں اکیلے حساب دینا ہو گا۔ تمہیں قبر سے اکیلے اٹھایا جائے گا۔ جو لوگ اس وقت تمہارے ارد گرد ہیں' ان میں سے کوئی بھی اللہ کے سامنے تمہارے کام نہیں آئے گا۔"[2]

(۱) بری یا تبرء کے تصور پر اس باب کے شروع میں گفتگو گذر چکی ہے۔

(۲) عمرو بن عبید مشہور معتزلی تھے' جنہوں نے واصل بن عطا کے ساتھ مل کر معتزلہ مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ یہ الفاظ انہوں نے خلیفہ منصور کو تنبیہ کرتے ہوئے کہے۔ ملاحظہ ہو شریف المرتضیٰ: الامالی (قاہرہ' ۱۹۵۴ء)' جلد اول' ص ۱۷۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاہم یہ نیا اصول بیک جنبش قلم قبائلی اخلاقیات کے اس معیار کو ختم نہیں کر سکتا تھا جو رشتوں کے فطری بندھنوں پر قائم تھا۔ اور سالہاسال پرانے قبائلی جھگڑے اسی اصول پر طے کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عہد اسلامی میں بھی کافی دیر تک یہ رواج قائم رہا۔ ہم نے دیکھا کہ مدینہ میں اوس اور خزرج کے دو متحارب قبیلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ایمانی اخوت اور دوستی کے باوجود بہت نازک قسم کی یکجہتی کے رشتے میں بندھے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابو قیس کے، جو ایک مشہور زاہد شخص تھے اور جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد اسلام قبول کیا تھا، شعروں میں ابھی عصبیت کی آواز سنائی دیتی ہے۔[۱]

یا بنی الارحام لاتقطعوها

وصلوها قصیرة من طوال

"اے میرے بیٹو! رشتوں کو نہ توڑو، تمہارے رشتے تنگ دل ہوں بھی تو ان کو گلے سے لگاؤ۔"

عصبیت کا جذبہ انسان کے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک میں رہنمائی کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی کارفرما ہوتا تھا جب رشتے دار کسی دشمن کے جھنڈے تلے جمع ہوں۔ ظہور اسلام کے بعد عرب میں یہ واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ نے جب مکہ سے ہجرت کر کے شاہ حبشہ کے ہاں پناہ لی تو ایک قریشی ان تمام لوگوں کو ختم کرنے [۲۱] کے لیے خون پر اتر آیا تھا، اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں ایک خدا ترس آدمی یہ الفاظ استعمال کرتا ہے:

"ایسا مت کرو، وہ ہمارے خون کے رشتہ دار ہیں، اگرچہ اس وقت وہ ہمارے مخالفین میں شامل ہیں۔"[۲]

جنگ احد میں حضرت علیؓ مسلمانوں کا علم اٹھائے ہوئے تھے اور ابو سعید مشرکین

(۱) سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۳۲۔

(۲) سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۶۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں دو بدو لڑائی میں مقابل آئے تو حضرت علیؓ نے مقابل کو چت تو گرا لیا لیکن انہیں قتل کرنے سے باز رہے۔ بعد میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے انہیں قتل کیوں نہیں کیا تو آپ نے فرمایا' مجھے اس آخری لمحے میں خون کے رشتے نے کمزور دل بنا دیا تھا۔[۱]

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو آپ نے اپنے نئے اصول کے مطابق ایک اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی جو قبیلے کے اصولوں سے بالاتر تھا۔ آپ نے اعلان کیا کہ تمام مہاجر اور انصار آپس میں ایک دوسرے کو دینی بھائی سمجھیں۔ یہ بھائی چارہ پچھلے تمام رواجوں کو اور خون کے رشتوں کے قانون کو منسوخ کرتا ہے۔ مومن صرف مومنوں کے دوست ہوں گے اور کافر کافروں کے۔ حسب نسب اور خون کے تمام رشتے ناقابل اعتبار ہوں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو علاقے میں ناقابل تلافی اخلاقی فساد برپا ہو گا۔ اس تمام کے باوجود آپ کے زمانے میں بھی جاہلیت کی طرح قبائلی جھگڑے اٹھتے رہے۔ اگرچہ وہ پہلی انتہا کو نہیں پہنچے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ واضح ہوتا گیا کہ اس بارے میں کچھ رعایتیں دینا ہوں گی۔ قرآن کریم کی سورہ ۳۳ آیت ۶ میں اسی قسم کی رعایت کا اعلان ملتا ہے:

> النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجه امھتھم واولو
> الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتب الله من المومنین
> والمھجرین الا ان تفعلوا الی اولیئکم معروفا (الاحزاب:۶)
>
> ”پیغمبر! مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور پیغمبر کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ اور رشتہ دار آپس میں کتاب اللہ کی رو سے مسلمانوں اور مہاجرین سے زیادہ ایک دوسرے کے حق دار ہیں' مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ احسان کرنا چاہو۔“

---

(۱) سیرو ابن ہشام' جلد ۳' ص ۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیت کا کلیدی نکتہ "کتاب اللہ" کی ترکیب کے معانی میں مضمر ہے۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں اس سے مراد وراثت کا حق ہے۔ اگر یہ تاویل مان لی جائے تو اس پوری آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو لوگ خون کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، وہ وراثت کے معاملے میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ یہ حکم فطری طور پر مسلمانوں کے درمیان اخوت کے اصول کو لامحدود سمجھنے پر ایک طرح کی پابندی لگاتا ہے۔ یعنی اب یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ آپس میں نسبی طور پر کیا رشتہ رکھتے ہیں۔ بہرکیف تاریخ اسلام میں اکثر قدیم قبائلی مفادات مذہبی رشتوں پر غالب نظر آتے ہیں۔

اس کے برعکس اس عبوری دور میں دنیائے عرب میں چند ایسی خصوصیات کا
[۴۲] ظہور بھی ملتا ہے، جو قدیم قبائلی عصبیت کی مخالف ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے ماضی قریب میں قبائلی بندھنوں کے کمزور ہونے کے شواہد ملتے ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انفرادیت بتدریج مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ پروفیسر واٹ لکھتے ہیں کہ ذاتی لافانیت یعنی خلود کے بڑھتے ہوئے شعور نے قبائلی انسان دوستی کے اصول کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہم اسی مسئلے کو ایک مختلف زاویے سے گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں۔ پروفیسر واٹ(۱) قبائلی انسان دوستی کو ایک اہم دینی قوت گردانتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ قبیلے کے وجود کے مقابلے میں ایک فرد کی تقدیر کا مسئلہ دراصل ایک انسان کے خاتمے کا مسئلہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عصبیت کے مقابلے میں انفرادیت کا ارتقاء غالباً مکہ میں تجارتی زندگی کے فروغ کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس تجارتی زندگی کے مرکز میں ایسا ہونا فطری بات تھی کہ مادی اور اقتصادی مفادات نے انفرادیت کو جنم دیا اور اس دور کی سماجی زندگی پر ایک نئی معاشرت کی بنیاد کے طور پر اثرات مرتب کیے۔(۲) اگر ان دلائل کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس وقت کی فضا میں زندگی کے نئے تصور کے

(۱) منٹگمری واٹ، محولہ بالا، صفحات ۱۹، ۲۵

(۲) ایضاً ص ۴۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ ایک نئے عہد کا شعور موجود تھا، جس کی وجہ سے قبائلی انسان دوستی کی بجائے انفرادی انسان دوستی کی بنیاد پر ایک نئی مذہبی سیاسی معاشرت قائم ہو سکتی ہے۔

ہم نے اب تک جاہلی عصبیت کی ایک تفصیلی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ پس منظر قارئین کے سامنے لا دیا جائے جس سے بالعکس اسلام کے اخلاقی تصورات کے خصائص واضح ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سماجی طرز زندگی میں جہاں قبائلی اخلاقیات ہی اتحاد کا واحد ممکن اصول ہوں جس کی بنیاد پر لوگوں میں متوازن اور بہتر نظام قائم کیا جا سکے۔ وہاں تمام اچھی خصوصیات قبیلے کے افراد کی بجائے خود قبیلے سے منسوب خیال کی جاتی ہیں۔ آج کی دنیا میں ہم یہ سمجھنے کے عادی ہیں کہ اخلاقی خوبیاں ذاتی صفات ہوتی ہیں جو افراد میں موجود ہوتی ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اخلاقی خوبیاں دراصل ایسی مشترکہ اجتماعی دولت کا نام تھا جو آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ کسی بھی شخص کو عظمت اور شان (مجد) ہمیشہ اپنے قبیلے سے وراثت میں ملتی تھی۔ ہر شخص کو احساس تھا کہ اس قبائلی خصوصیت کو اگلی نسلوں تک کسی کمی کے بغیر پہنچانا اس کا مقدس فریضہ ہے بلکہ ہو سکے تو اس میں مزید اضافہ کرے۔

ورثنا المجد من آباء ئنا فنمی نبا صعدا[1]

"ہم نے عظمت اپنے آباؑ سے میراث میں پائی ہے۔ ہمارے پاس آ کر یہ بلندیوں تک جا پہنچی۔"

ایسے سماجی نظام میں ذاتی صفات کو قبیلے کے شرف سے علیحدہ سوچنا ممکن نہ تھا۔ استثنا تھی بھی تو چند ایسے افراد کے حوالے سے جنھوں نے اپنی ذاتی بہادری اور کوشش سے شہرت
[۶۳] حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں انھیں کسی نامور خاندان سے کوئی مدد نہیں ملی تھی۔ ایسے افراد

(۱) سیرہ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۲۸۳، شاعر کا نام محافر بن ابی عامر تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خارجی[۱] کے نام سے جانے جاتے ہیں' تاہم اس طرح کے لوگ شاذ و نادر اور اتفاق سے پیدا ہوتے تھے۔ عام طور پر قبیلے کا ہی کسی شخص کی عمدگی اور منقبت کی غیر مشکوک ضمانت اس کے آباؑ کا عزت و شرف ہی تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری میں اپنے قبیلے کے آباؤ اجداد کی خصوصیات پر اتنا فخر کیوں کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو طالب قریش کی مدح میں فرماتے ہیں:

> "اگر ہم تمام لوگوں کا موازنہ کریں تو تم ایک موتی ہو۔ تم لوگوں کو ایک قابل احترام نسب کی بنیاد پر ذی وجاہت اور افضل حالت میں قائم رکھتے ہو' جن پر اخلاط کا کوئی دھبہ نہیں۔"[۲]

قبائل کے شاندار کارنامے بڑے عزت و احترام کے ساتھ سینہ بہ سینہ روایت کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں اور اس عمل کے دوران ان میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ قبائلی عظمت کا اس طرح جو نقشہ بنتا ہے' اسے لفظ حسب سے یاد کیا جاتا ہے' جس کا قریب قریب ترجمہ "عظمت اسلاف" کیا جا سکتا ہے۔[۳] ہر ممتاز خاندان کا اپنا ایک حسب ہوتا ہے جس پر وہ فخر کرتے ہیں۔ حسب وہ حتمی پیمانہ ہے جس کے ذریعے ایک قبیلے کی اقدار اور بالآخر اس قبیلے کے ہر فرد کی اعلیٰ صفات کو ناپا جاتا ہے۔ قدرے مختلف زاویے سے دیکھا جائے تو قبائلی طرز معاشرت میں اخلاقی برتاؤ کے لیے حسب ہی واحد اور ممکن رہنما نظر آتا ہے۔ کیونکہ قبیلے کا ہر فرد اپنے شاندار حسب کو جو اس نے آباؤ اجداد سے ورثے میں پایا

(۱) مثلاً دیکھئے مفضلیات (تحقیق کارلوس لایل' ۱۹۲۰ء) ص ۱۰۶۔ حصین بن حمام کا شعر:

لدن غدوۃ حتی اتی الیل ماتری　　من الخیل الا خارجیا مسوما

خارجی ایسے گھوڑے کو کہتے تھے' جو نسب کے بغیر بھی عمدہ ہو۔

(۲) ہمیں ابن ہشام (جلد اول' ص ۲۹) پر صرف مندرجہ ذیل شعر اس مفہوم میں ملا ہے:

رجال کرام غیر میل نما ھم　　الی الخیر آباء کرام المحاصل

(۳) مثلاً دیکھئے المفضلیات' محولہ بالا نمبر ۲۵: ۳ جو حسب کے تصور کے عناصر ترکیبی کی وضاحت کی عمدہ مثال ہے۔ (ہمیں المفضلیات میں ایسا کوئی شعر نہیں ملا' مترجم)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اعلیٰ ترین مثالی اقدار کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ برتاؤ کا ایسا کامل نمونہ جس کی تقلید زندگی کے ہر حال میں ضروری ہے۔ اس کے تمام افعال و اعمال پر اس کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ بالعکس اس کے تمام اعمال کے درست یا غلط جانچنے کا صرف یہی ایک پیمانہ ہے۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ایک غیر تحریر شدہ ضابطہ قانون بن جاتا ہے۔ (۱)

من محشر سنت لهم آبأوهم
و لكل قوم سنه و امامها

"اس کا تعلق ایسے قبیلے سے ہے، جس کے اسلاف نے ان کے لیے سنت (ضابطے) طے کر دی ہے۔ ہر قوم کی اپنی سنت اور (قابل تقلید) امام ہوتا ہے۔"

اس طرح کا ضابطہ قانون یا طرز زندگی یا اس کے برعکس یوں کہیے کہ اسلاف کی عزت و قار کا دستور سنت کہلاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم عرب میں سنت کو اتنا محترم مقام کیوں حاصل تھا اور اسے تقریباً مقدس کیوں سمجھا جاتا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد بھی آخری زمانے تک ایسے کئی واقعات ملتے ہیں، جن میں حسب کا یہ غیر معمولی جذبہ اپنے اسی زور شور کے ساتھ مسلسل موجود نظر آتا ہے۔ غالباً اس کا سب سے دلچسپ مظہر شعوبیہ کی تحریک ہے جو عہد عباسی کے اوائل میں اُبھری۔ یہاں ہم
[۶۴] دیکھتے ہیں کہ قبائل کے مابین جو قدیم عداوت موجود تھی، وہ اسلامی معاشرت میں عرب اور غیر عرب کے درمیان ایک بہت بڑے پیمانے پر مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ شعوبیہ ایسی تحریک تھی جو تمام مسلمانوں کے درمیان مکمل مساوات کی دعویدار تھی جس میں نسل، قوم یا حسب نسب کی تفریق نہ ہو۔ ابن عبد ربہ کی کتاب العقد الفرید کے مطابق اس دعویٰ کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں فخر و مباہات سے منع کیا۔ تاہم عرب اپنے عالی نسب ہونے پر مستقل فخر کا اظہار کرتے رہے۔ اور غیر عرب کو ہمیشہ جاہلیت

(۱) معلقہ لبید بن ربیعہ، کتاب شرح قصائد العشر تالیف خطیب تبریزی، تحقیق کارلس لایل، کلکتہ، ۱۸۹۴، ص ۸۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مخصوص رویہ کے ساتھ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم منطقی اور حقیقی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس فخرو مباہات کے لیے بہتر بنیادیں موجود ہیں۔

شعوبیہ اپنے اس استدلال کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ کے وہ مشہور الفاظ نقل کرتے تھے جو آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمائے تھے:

> "اے بنی آدم! اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں سے اپنے آباؑ پر فخرو مباہات کے جذبے کو نکال دیا ہے جو جاہلیت کے لوگوں کا خاصہ تھا۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا۔"

یہ نکتہ اخلاقی معاملات میں اسلام کے موقف کو صحیح سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ عرب شرفاء میں اپنے آباؑ کی عزت کے جذبہ سے وابستگی بہت گہری تھی۔ اسلام کے لیے ان اقدار کے بے وقعت ہونے کا اعلان صرف اس عقیدہ کی وجہ سے ممکن ہوا کہ یہ فخرو مباہات بے بنیاد دھوکہ ہے' یہ دنیوی زندگی کی ظاہری شان و شوکت کا پیدا کردہ سراب ہے اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس ہیبت ناک دن میں جب ہر شخص کو اس کی قبر سے نکالا جائے گا اور حساب کے لیے اسے بالکل عریاں پیش کیا جائے گا تو اس کے ذاتی ایمان اور نیک اعمال کے سوا جو اس نے دنیا میں محض مذہبی نیت سے کیے ہوں گے' کچھ کام نہیں آئے گا۔

اب تک ہم نے دیکھا کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں عصبیت کے اصول کی بنیاد زیادہ تر فخرو مباہات کے اس احساس پر رکھی گئی تھی جو ایک اعلیٰ نسل سے وابستہ ہونے کے شعور سے پیدا ہوا تھا۔ اعلیٰ ذاتی خصوصیات کسی شخص میں تبھی نشوونما پاسکتی تھیں جب اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہو۔ یقیناً عزت و آبرو قبل از اسلام معاشرت کا کلیدی تصور تھا۔ یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں عزت کو قائم رکھنے اور داغدار ہونے سے بچانے کے لیے شجاعت اور بہادری ضروری تھی۔ جو خود جذبہ اباء یعنی انکار کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ زیادہ واضح الفاظ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوں کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ اِباءِ انسانی یا الٰہی اقتدار کے سامنے جھکنے سے انکار کا نام ہے۔ مختصراً یہ کہ مکمل آزادی کا جذبہ، مغلوبیت سے شدید نفرت، غرور و تکبر اور اپنی قوت اور بل بوتے پر بھروسے پر مبنی فخر کے احساس کا نام ہے۔ ایسا جذبہ صرف شریف لوگوں سے ہی متوقع تھا۔ زمانہ جاہلیت میں عصبیت کے بطور دین موثر ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ شرفاء کا مذہب تھا۔ کمزور، غریب، کم نسب اور بے خاندان شخص یا غلام — یا دوسرے الفاظ میں عام لوگ — اس مذہب میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔

[۶۵] ایسے شریف اور آزاد شخص کے لیے غلامی سے بڑھ کر ذلت کی کوئی شکل نہیں تھی کیونکہ غلام کا کام اپنے آقا کی اطاعت کرنا تھا۔ ایک شریف عرب کے لیے اس قسم کی اطاعت انسان کی ہو یا خدا کی ناقابل برداشت تھی۔ جب کہ اسلام کا مطالبہ بعینہ یہی تھا کیونکہ قرآنی تعلیمات میں اللہ تعالیٰ آقا ہیں اور انسان کی حیثیت اس کے ایک ماتحت غلام سے زیادہ کچھ نہیں۔

پچھلے باب میں یہ ذکر ہو چکا کہ قرآن کریم خداخوفی کو ایک ایسے منصف سے خوف اور ہیبت میں تبدیل کر کے جو کبھی غلطی نہ کرے اور کسی سے نرمی نہ کرے، اسے انسانی وجود کا بنیادی رویہ قرار دیتا ہے۔ ہم نے اس سے قبل اس قرآنی آیت کا ذکر بھی کیا جس میں شرافت کی تعریف خوف خدا کے لفظ سے کی گئی ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات:۱۳)

"تم میں سب سے زیادہ عزت والا، اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔"

ہم اسی آیت کے بارے میں اب ایک اور نکتہ بھی بیان کرنا چاہیں گے۔ اس آیت میں اسلام کا جو موقف بیان ہوا ہے، وہ زمانہ جاہلیت کے قدیم تصور کے ساتھ براہ راست دو طرح سے متصادم ہے۔ اول تو یہ آیت ذاتی خوبیوں کو قبیلے کی بجائے فرد میں مرکوز کرتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے یہ ایک ایسی بات کو خوبی کے طور پر بیان کرتی ہے جسے زمانہ جاہلیت کے مغرور جنگجو کمزوری اور ذلت سمجھتے تھے۔ پہلے نکتہ پر تو بات ہو چکی ہے' اب ہم دوسرے نکتے یعنی اسلام کے اخلاقی تصورات میں عجز اور انکساری کو ایک بنیادی عنصر قرار دینے کے بارے میں بات کریں گے۔ اس مسئلے کے دو مختلف لیکن ایک دوسرے سے وابستہ پہلو ہیں۔ ایک معاشرتی اور دوسرا روحانی۔

جاہلی معاشرتی نظام میں کمزور' مظلوم' کم نسب اور غلاموں کا اس عظمت و شان میں کوئی حصہ نہیں تھا جو نسل در نسل منتقل ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اسلام نے شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم کے عالم گیر ہونے پر زور دیا۔ وہ خدا جو قیامت کے روز اپنی پوری ہیبت کے ساتھ جلوہ گر ہو گا۔ وہ انتہائی مہربان اور رحیم خدا بھی ہے جو غریب اور امیر' طاقت ور اور کمزور میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس خدا کے سامنے تمام انسان برابر ہیں ان کا معاشرے میں کوئی بھی درجہ ہے اور کوئی بھی حسب و نسب ہو۔ نہیں بلکہ وہ کمزور اور بے وقعت لوگوں کو مغرور شرفا کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے' اے سب سے مہربان تو جو مظلوموں کا خدا ہے تو ہی میرا رب ہے۔[1] اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ مومنوں کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ نہایت رحمدلی کا سلوک کریں۔ قرآن کریم میں ایسے احکام اور اوامر لاتعداد ہیں جن میں اسی جذبے کا اظہار ہے:

ما افاء الله علی رسوله من اهل القری فلله وللرسول ولذی القربیٰ والیتمٰی والمسکین وابن السبیل کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم وما اتاکم الرسول فخذوه ومانهاکم عنه فانتهوا واتقوا الله (الحشر:۷)

"جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ خدا'

---

(۱) نکلسن' محولہ بالا' ص ۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیغمبر، رشتہ داروں، حاجت مندوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ تم میں جو لوگ دولت مند ہیں مال انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔ سو جو چیزیں تم کو پیغمبر دے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔"

جو لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور غریبوں اور محتاجوں کی معمولی مدد سے بھی [۲۲]
انکار کرتے ہیں وہ صرف بخیل نہیں ہیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے اس کا سبب اس سے کہیں گہرا ہے۔ اس مخصوص بے رحمی کے رویہ کا اصل منبع ان کا کفر کا رویہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل کا شکر نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے بخیل ہیں کہ وہ اندر سے ناقابل اصلاح کافر ہیں۔

ارءیت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم ولایحض علٰی طعام المسکین فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون الذین ھم یراءون ویمنعون الماعون (الماعون)

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں بھی عاریت نہیں دیتے۔"

مندرجہ ذیل آیت میں کافروں کے اس رویے پر براہ راست تنقید کی گئی ہے:

"کلا بل لا تکرمون الیتیم ولاتحضون علی طعام المسکین وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما (سورہ الفجر: ۱۷۔۲۰)

"نہیں بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ تم میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔"

قرآن میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ نے ایک غریب نابینا شخص سے بے توجہی برتی تو خود رسول خدا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہے اس کا عنون "عبس" اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ایک روز ابن ام مکتوم ایک نابینا صحابی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ قریش کے سرداروں سے بات چیت کر رہے تھے۔ ابن ام مکتوم نے اسلام کے بارے میں چند غیراہم سوال پوچھنا شروع کر دیئے۔ حضرت محمد ﷺ اس دخل اندازی پر ناراض ہوئے اور ان سے منہ پھیر لیا۔ فوراً وحی نازل ہوئی جس میں اس رویے پر آپ پر تنقید کی گئی کہ امیر اور طاقتور لوگوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور غیراہم لوگوں کو نظرانداز کرنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔

عبس وتولی ان جاء ہ الاعمی وما یدریک لعله یزکی او یذکر فتنفعه الذکریٰ اما من استغنی فانت له تصدی وما علیک الایزکی واما من جاء ک یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنه تلھیٰ (سورہ عبس:۱۱۱)

"وہ ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا۔ جو پروانہیں کرتا تم اس کی طرف تو توجہ دیتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ نہیں اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے' اس سے تم بے رخی اختیار کرتے ہو۔"

اور بھی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو بہت نرم الفاظ میں فہمائش [۶۷]
کرتے ہیں اور بعض اوقات لہجہ ذرا سا سخت بھی ہو جاتا ہے کہ وہ غریب لوگوں کو دھتکاریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں اور نہ ہی انہیں حقارت سے دیکھیں کیونکہ بہرکیف یہی لوگ ہیں جو اسلام اور اطاعت کی تعلیم کو سب سے زیادہ قبول کر سکتے ہیں۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه ولاتعد عینک عنهم ترید زینة الحیوه الدنیا (الکهف:۲۸)

''جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں' ان کے ساتھ صبر سے کام لو' تمہاری نگاہیں' ان سے نہ ہٹیں کہ تم آرائش زندگی کے خواستگار ہو جاؤ۔''

ایک اور سورہ میں اللہ تعالیٰ پیغمبر کو فرماتے ہیں کہ وہ یتیموں پر ظلم نہ کریں اور مانگنے والوں کو دھتکاریں نہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ لہجہ بہت ہی قربت کا ہے۔

الم یجدک یتیما فاوی و وجدک ضالا فهدی ووجدک عائلا فاغنی فاما الیتیم فلا تقهر واما السائل فلا تنهر (سورہ الضحی: ۶-۱۷)

''بھلا اس نے تمہیں یتیم پایا تو ٹھکانا نہیں دیا۔ تمہیں راستے سے ہٹا پایا تو ہدایت نہیں دی تمہیں تنگ دست پایا تو غنی نہیں کر دیا۔ تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔''

یاد رہے کہ ان آیات میں حضرت محمد ﷺ کی بچپن کی زندگی کے ناخوشگوار ذاتی حقائق کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ انہیں یہ یاد دلایا جائے کہ وہ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے اور چنانچہ اسی وجہ سے انہیں غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ وسیع تر مفہوم میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو نرم خو اور رحم دل ہونا چاہیے کیونکہ خدا بھی رحمان اور رحیم ہے۔

یاد رہے کہ ان آیات میں حضرت محمد ﷺ کی بچپن کی زندگی کے ناخوشگوار ذاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقائق کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ انہیں یہ یاد دلایا جائے کہ وہ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے اور چنانچہ اسی وجہ سے انہیں غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ مہانی سے پیش آنا چاہیے۔ وسیع تر مفہوم میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو نرم خو اور رحم دل ہونا چاہیے کیونکہ خدا بھی رحمان، رحیم اور انتہائی محبت کرنے والا خدا ہے۔ انسان کی نیکی اللہ تعالیٰ کی نیکی کا پرتو ہے۔ اگرچہ یہ کسی بھی صورت میں نہ اس کی برابری کر سکتی ہے، نہ اس سے موازنہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسانی نیکی بہرکیف ناقص اور نامکمل پرتو رہے گی۔ ایک اور آیت میں اس بات کو یوں کہا گیا ہے:

واحسن کما احسن اللہ الیک (القصص: ۷۷)

"لوگوں سے بھلائی کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے پاس بھلائی کی ہے۔"

اس موقع پر یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رہنی چاہیے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی انتہائی فیاضی کی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں یتیم بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور کمزوروں کی مدد کرنا بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ بظاہر جاہلی ذہن مسلمانوں سے زیادہ وسیع القلب اور خیرات کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے تاہم دونوں کے بنیادی مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ جاہلی ذہن ذاتی خوشی اور فخر و غرور کے لیے یہ کام کرتا ہے اور مسلمان ذہن اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کرتا ہے۔

چنانچہ اس بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عاجزی اور انکساری کا عنصر جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں انسانی خصوصیت ہے یہ اسلامی اخلاقیات کا بنیادی نکتہ بنا دیا گیا ہے۔

[۶۸] اسلام میں تمام نہیں تو اکثر واجبات دراصل اسی نیک جذبے کی پیداوار ہیں۔ مومنوں کے لیے ہر ممکن موقع پر نرم دلی کا حکم دیا گیا ہے۔ خاندان کے معاملات ہوں یا معاشرے کے تمام انسانی معاملات میں نرم دلی کو بنیادی اصول ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنے والدین کے سامنے عاجزی اور نرمی سے پیش آنا چاہیے اور ان سے ہمیشہ نیک سلوک کرنا چاہیے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقضی ربک الا تعبدو الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما اوکلیھما فلا تقل لھما اف ولاتنھرھما وقل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمه وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا (الاسراء:۲۳-۲۴)

"اور تمہارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے ادب سے بات کرنا۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں شفقت سے پرورش کیا ہے تو بھی ان پر رحمت فرما۔"

ووصینا الانسان بوالدیه احسنا حملته امه کرھا و وضعته کرھا وحمله وفصله ثلثون شھرا (الاحقاف:۱۵)

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے جنا۔ اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا تیس مہینوں میں ہوا۔"

اسلام نے سالہاسال سے جاری خون کے بدلے خون کا رواج ختم کرنے کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی وہ بھی اسی اصول کا کھلم کھلا مظہر ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ خون کا بدلہ صحرائی زندگی کا سب سے اعلیٰ قانون تھا۔ اس کا عرب کے تصور شرف سے گہرا تعلق تھا۔ مروہ (مروت) کے تصور کا بنیادی عنصر یہ تھا کہ بدلہ لینے میں مستقل مزاجی لازمی ہے۔ بدوؤں کا سب سے اعلیٰ اخلاقی معیار یہی مروت کا تصور تھا جس کا ہم پہلے مختصراً ذکر کر چکے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں انسان کی ایک اہم ذاتی صفت مروت تھی۔ نکلسن نے بدلے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارے میں عرب جذبات کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

"یہ ایسی تکلیف دہ پیاس تھی جسے صرف خون ہی بجھا سکتا تھا۔ یہ عزت و شرف کی اک بیماری تھی، جسے دیوانگی کہا جا سکتا ہے۔"(۱)

زمانہ جاہلیت کی عرب روح میں یہ جذبہ اتنی گہرائی میں جاگزیں تھا کہ اس سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ اسلام نے اس ہولناک دیوانگی کو کم کرنے کے لیے چند سخت پابندیوں کا اعلان کیا۔ چنانچہ یہ حکم ہوا کہ بدلے کے سلسلے میں انصاف کا مطالبہ صرف مجرم کی ذات سے کیا جائے گا اور یہ کہ ایک جان کے بدلے میں ایک جان ہی لی جائے گی۔ آزاد کے بدلے میں آزاد، غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت اور یہ کہ اگر مقتول کے رشتہ دار خون بہا قبول کر لیں اور اس معاملے میں صلح کا طریقہ اختیار کریں تو بہتر ہو گا۔(۲)

اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے، اسلام میں بدلے کا حق انسان سے لے کر اللہ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ زمانہ جاہلیت میں خون کا بدلہ انسان ہی انسان سے
[۴۹] لیتا تھا۔ بدلہ انسانی رشتوں اور انسانی سطح پر ہی ہوتا تھا۔ اسلام میں بدلے کا رخ عمودی کر دیا گیا۔ یا یوں کہیے کہ ایک نئی عمودی سمت ظاہر ہوئی جو افقی خط کو کاٹنے لگی۔ زمین پر کی گئی تمام برائیوں اور زیادتیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا انتقام گیر قرار دیا گیا۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں واضح طور پر دوزخ کے عذاب کو بہت بڑے پیمانے پر انتقام خداوندی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔(۳) دو قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کو ذو انتقام کہا گیا۔(۴) چنانچہ اللہ ایسا ہے جو

(۱) نکلسن حوالہ بالا، ص ۴۳

(۲) القرآن سورۂ بقرہ: ۱۷۸: الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی فمن عفی له من اخيه شئ فاتباع بالمعروف واداء اليه باحسان۔

(۳) مثلاً دیکھیے سورۂ الحجر آیت ۷۹، الروم: ۴۷، الدخان: ۱۶ (ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کے منتقم ہونے کا ذکر ہے۔ پہلی دو مثالوں میں اللہ تعالیٰ کے اسی دنیا میں ظالموں سے انتقام لینے کا ذکر ہے۔ آخری مثال کا تعلق آخرت سے ہے۔

(۴) سورۂ ابراہیم: ۴۷ اور الزمر: ۳۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے تمام اعمال سے باخبر ہے اور جو وعدہ کرتا ہے کہ جن لوگوں نے زیادتیاں کی ہیں' ان سے وہ بدلہ لے گا۔ چنانچہ اس صورت حال میں انسان کے لیے اس سے بہتر اور کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ان تمام معاملات کو مشیت الٰہی کے سپرد کر دے۔ اگرچہ عملی طور پر بدلے کے مسائل میں ابھی بہت سی مشکلات باقی تھیں' تاہم کم از کم اصولی طور پر یہ نتیجہ بہت صریح اور واضح تھا اور یہاں بھی انسانی عمل کا رہنما اصول محبت اور رحمدلی ہی تھا۔

یہ ساری صورت حال ایک طرح سے حلم کے اصول کو اسلام میں اخلاقی نظام کا بنیادی نقطہ بنا کر کی گئی۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ عربی زبان میں حلم کا تصور قدیم یونانی اتار قصیا کے مترادف ہے جس کا مطلب تھا کہ معمولی سے بہانے پر برانگیختہ ہونے اور حرکت میں آنے کی بیماری سے افاقہ (۱)

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجٰهلون قالو سلما (الفرقان :٦٣)

"اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہتے ہیں۔"

اسلام کی طرف سے حلم کے اصول کو اپنانے کا مطالبہ اور اس کے اعلیٰ ترین تصور کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش زمانہ جاہلیت کے عرب کے لیے جو کہ پیدائشی طور پر بہت جذباتی اور بھڑک اٹھنے والی طبیعت کا مالک تھا' انتہائی مشکل دکھائی دیتی ہو گی۔ چنانچہ درحقیقت قرآن کریم میں اس طرز زندگی کو عقبہ یعنی پہاڑی راستے پر سب سے مشکل چڑھائی سے تشبیہ دی گئی ہے' تاہم اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ جو لوگ اس کی تمام مشکلات پر قابو پا لیں گے' وہ قیامت کے دن دائیں ہاتھ والے لوگوں کے ساتھ ہوں گے یعنی وہ جنت میں جائیں

(۱) قرآن حکیم کی تعلیمات میں حلم کے تصور کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے۔ تاہم اس کے باوجود قرآن میں اس لفظ کا استعمال اتنی اہمیت کا حامل نہیں' ہم نے اس سوال کا جواب اپنی ایک اور کتاب "خدا اور انسان' قرآن میں" میں بہت تفصیل سے دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے اور اس کی ابدی نعمتوں سے فیض یاب ہوں گے جبکہ بائیں جانب کے ساتھی آگ کے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

وما ادریک ما العقبہ فک رقبہ او اطعام فی یوم ذی مسغبہ یتیما ذا مقربہ او مسکینا ذا متربہ ثم کان من الذین امنوا وتواصو بالصبر و تواصوا بالمرحمہ (البلد: ۱۲-۱۷)

''اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کا آزاد کرنا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا' یتیم رشتہ دار اور مسکین کو جو مٹی میں مل گیا ہو۔ پھر ان لوگوں میں داخل ہونا جو ایمان لائے' صبر کی تلقین کی اور لوگوں سے نرم سلوک کی نصیحت کرتے رہے۔''

[۷۰] اب تک تو ہم نے رحمدلی کے مسئلے کے سماجی پہلو کا ذکر کیا تھا۔ اب ہم اس کے روحانی پہلو کی طرف آتے ہیں۔ شروع میں ہی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عاجزی اور انکساری کا تصور صحرائی عرب کی آزاد روح کے احساس شرف اور اس کے تند و تیز غرور کے جذبات سے براہ راست متصادم ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حمیت جاہلیہ بدوی ذہن کا خاصہ ہے۔

اسلام جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے سب سے پہلے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان پورے طور پر عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ مسلم کا لفظی معنی اطاعت گذار' سپرد کر دینے والا یعنی ایسا شخص جس نے اپنے آپ کو اور اپنے دل و دماغ کو مشیت الٰہی کے سپرد کر دیا ہے۔ اسلام میں نیکی کی پہلی شرط اور اس کی بنیادی خصوصیت مکمل اور ارادی اطاعت ہے چنانچہ اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات جاہلیت کے طنز کا خصوصی نشانہ بنی۔ ایک مسلمان کی تمام بنیادی خوبیاں مثلاً عاجزی' صبر' خوف' غرور سے اجتناب' ایک بے باک جاہلی عرب ذہن کے لحاظ سے کمزوری اور عاجزی کا کھلم کھلا اظہار تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واذا قیل له اتق الله اخذته العزة بالاثم فحسبه جهنم ولبئس المهاد (البقرہ:۲۰۶)

"اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کر تو عزت[1] اور غرور اسے گناہ میں پھنسا دیتا ہے' سو اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔"

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم میں خوف خدا یعنی تقویٰ کو دین کا بنیادی رویہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک سچے مومن کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے ڈر سے کانپتا ہے۔ اے لوگو! اللہ کا خوف کرو (سورہ الحج:۱) اے ایمان والو! خدا کا خوف کرو۔ ہر نفس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے۔ اللہ سے ڈرو کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو جانتا ہے۔ (سورہ الحشر:۱۸) پھر یہ بھی کہا گیا ہے جو قربانیاں تم کرتے ہو' اس کا گوشت اور خون اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتا' یہ صرف تمہارا تقویٰ ہے جو اس تک پہنچتا ہے۔ (سورہ الحج:۳۷) ان تمام آیات پر غور کرنے سے بہت آسانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں خوف قریب قریب عقیدے اور عبادت کے مترادف ہے۔ اپنے کو اللہ کے سپرد کر دینے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی عاجزی سے پابندی کرنا جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں' دراصل اسی جذبے کا ایک پہلو ہے۔

وقالو لن یدخل الجنة الامن کان هودا او نصریٰ تلک امانیهم قل هاتوا برهانکم ان کنتم صٰدقین بلٰی من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه (البقرہ: ۱۱۱-۱۱۲)

"وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان لوگوں کے اپنے خیالات ہیں' ان سے کہہ دو اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ ہاں جو شخص خدا کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکی کرے تو اس

(۱) دیکھیے تفسیر بیضاوی' جہاں عزہ کا معنی حمیت جاہلیت بتایا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا صلہ اللہ کے پاس ہے۔"

یہی بات اس مکمل اعتماد پر بھی صادق آتی ہے جو ایک سچے مومن اللہ کے احسان پر ہوتا ہے۔ اللہ پر مکمل توکل کا جذبہ کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے' ایک انسان کا اللہ تعالیٰ پر اعتماد [اے]کمزور نہ ہو' ایک سچے مسلمان کی بنیادی خوبی بتائی گئی ہے۔

ان الحکم الا اللّٰہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون (یوسف ٦٧:)

"بے شک حکم صرف اللہ کا ہے' میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور توکل کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

و علی اللہ فلیتوکل المومنون ومالنا الا نتوکل علی اللہ و قد ھدینا سبلنا و نصبرن علی ما اذیتمونا وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون (ابراہیم:١١-١٢)

"اور مومنوں کو خدا پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے اور ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ رکھیں جب اس نے ہمیں سیدھے راستے دکھائے اور جو تکلیفیں تم ہمیں دیتے ہو' ہم ان پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔"

و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین (المائدہ : ٢٣)

"اور اگر تم مومن ہو تو اللہ پر ہی بھروسہ رکھو۔"

آخری آیت خاص طور پر بے حد اہم ہے کیونکہ اس میں قرآن کریم میں ایمان اور توکل کے مابین معنویاتی رشتے کو بہت واضح اور صریح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح اگلی آیت میں خوف خدا اور انکساری کے مابین قریبی رشتے کو دکھایا گیا ہے:

وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم (الحج:٣٤-٣٥)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اور گردن جھکا دینے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے' جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔"

یہاں خوف کے لیے لفظ تقویٰ استعمال نہیں ہوا بلکہ وجل کا فعل کا صیغہ آیا ہے جس کا مطلب ہے خوف سے دل کا دھڑکنا یا انتہائی خوف محسوس کرنا۔ جہاں تک انکساری اور عاجزی کا تعلق ہے' اس کے لیے لفظ مخبت آیا ہے۔ جو اخباط کا اسم صفت ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جو قریب قریب انہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ہم یہاں دو مثالیں دے رہے ہیں جن کے عمومی سیاق و سباق سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عاجزی کی صفت کے لیے کس قسم کا انسان برتاؤ درکار ہے:

واستعینوا بالصبر و الصلوۃ وانها لکبیرۃ الا علی الخاشعین الذین یظنون انهم ملقوا ربهم وانهم الیه راجعون (البقرہ:۴۵-۴۶)

"اور صبر اور نماز سے مدد لو بے شک یہ دشوار ضرور ہے سوائے ان لوگوں کے جو ڈرنے والے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور ان کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔"

قل اٰمنوا به اولا تؤمنوا ان الذین اوتوا العلم من قبله اذا یتلی علیهم یخرون للاذقان سجدا ویقولون سبحٰن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ویخرون للاذقان یبکون ویزیدهم خشوعا (الکہف:۱۰۸-۱۰۹)

"کہہ دیجئے تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا' جب یہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں' ہمارا رب پاک ہے' ہمارے رب نے جو وعدہ کیا' وہ اسے ضرور پورا کرتا ہے' وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتے ہیں' روتے ہیں اور اس سے ان کا ڈر اور بڑھ جاتا ہے۔"

عاجزی کے لیے ایک اور لفظ تضرع (ت ض ر ع) بھی استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت ہمارے موضوع کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے کیونکہ اس لفظ کو اس کے متضاد معنی الفاظ کے ساتھ استعمال کر کے اس آیت سے اس کی معنوی ساخت پر روشنی پڑتی ہے:

ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذنھم بالباساء والضراء لعلھم یتضرعون فلولا اذجاءھم تضرعوا ولکن قست قلوبھم وزین لھم الشیطن ماکانوا یعملون (الانعام: ٤٢-٤٣)

"ہم نے آپ سے پہلی امتوں میں رسول بھیجے پھر ان کو تنگدستی اور بیماری نے آ پکڑا تاکہ وہ عاجز آجائیں سو جب ان کو ہماری سزا نے آ پکڑا تھا تو وہ عاجزی اختیار کر لیتے مگر ان کے تو دل سخت رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں سجا کر دکھاتا رہا۔"

"دل سخت ہونا" قرآن کریم میں بار بار استعمال ہونے والی عبارت ہے جس کے ذریعے کافر کے مخصوص ذہنی رویے کی عکاسی کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ ایک باب میں جہاں مزید تفصیل کے ساتھ کفر کے تصور پر بحث کریں گے' اس بات کے لیے مزید شہادتیں بھی ملتی ہیں۔[۴۲] اس بحث سے معنوی تضاد کا ایک اہم فارمولا سامنے آیا یعنی تضرع (عاجزی)' کفر یعنی ناشکرے پن کا متضاد ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ قرآنی تصور میں ناشکراپن کفر کی بنیاد ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عاجزی ایمان کی بنیاد ہے۔

اس ضمن یہ ذکر نہایت اہم ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں جو عمومی رویہ تھا' قرآن کریم اسے بیان کرنے کے لیے استکبرأ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ استکبرأ کا فعل ک ب ر کے مادے سے نکلا ہے' جس کے قریب قریب معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا' مغرور اور خود پسند ہونا۔ ہم اس کی معنوی ساخت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے منفی پہلو کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس پر مزید بات آئندہ بھی ہو گی۔ تاہم یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ جہاں تک عاجزی کے تصور کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے کی بات ہے' اس میں اسلام اور جاہلیت دونوں ایک دوسرے کے بالکل مخالف سمتوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ساری اسلامی خوبیاں جو اس اصول سے اخذ کی گئی ہیں' وہ ان تمام بنیادی صفات کے برعکس ہیں جن پر صحرائے عرب کے لوگ فخر کرتے رہے۔ درحقیقت زمانہ جاہلیت کے عرب سے عاجزی اور اطاعت کی قطعاً توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے:

نابی علی الناس المقادۃ کلھم

حتی نقودھم بغیر زمام[1]

ہم تمام انسانوں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں' اس وقت تک جب وہ خود ہماری اطاعت کریں گے' بغیر لگام کے۔

وہ خدا کی بارگاہ میں بھی اپنے اس رویے کو تبدیل کرنے سے بھی ہٹ دھرمی سے انکار کرے گا کیونکہ اس کا ذہن جو بتوں یا خداؤں کی بے دلی سے عبادت کا عادی تھا' اس کے لیے خدا جو نہ تو مطلق ہستی ہے نہ ہو سکتا ہے' وہ انسانوں سے مکمل طور پر بالاتر نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک عاجزی کی صفت کا تصور ہے' جاہلی عرب کے لیے یہ کمزور دلی کی علامت تھی۔ اس کی نظر میں صرف ایسے لوگ عاجز ہو سکتے ہیں جن کا نسب اعلیٰ نہ ہو اور جنہیں فخر و غرور کا کوئی فطری حق نہ ہو۔

[۷۳] صحرا کی زندگی میں توکل ایک اعلیٰ صفت ضرور تھی' لیکن یہ اسلام کی طرح کسی اعلیٰ ہستی کی بارگاہ میں عاجزانہ انحصاری کا نام نہیں تھا۔ بلکہ یہ انسانی قسم کی انحصاری تھی جو قبیلے کے افراد تک محدود تھی لیکن اس میں سب سے زیادہ انسان کو خود اپنے پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ خود انحصاری شرافت کا نشان تھا۔ یہ وہ بنیادی رویہ تھا جس کے بارے میں توقع کی جاتی تھی کہ وہ

(۱) دیوان عبید بن الابرص' محولہ بالا' ص ۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان کے کردار کے ہر پہلو میں ظاہر ہو۔ اس کے لیے لفظ استغناء بولا جاتا تھا۔ یہ لفظ ایک ایسے مادے سے نکلا ہے جس کا معنی ہے ہر ضرورت سے بے نیاز ہونا اور اس سے انسان کا وہ رویہ مراد ہے جس میں وہ اپنے تمام اعمال میں اپنے آپ کو مکمل آزاد سمجھے جو ہر طرح سے خود مختار ہو اور صرف اپنے بل بوتے پر زندہ رہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ایسی خود اعتمادی خود پسندی کی انتہائی شکل ہے جو دراصل انسان کے مخلوق ہونے کا انکار کرتی ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اگر کسی کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہونے کا مکمل اختیار ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اس نکتے پر گفتگو آئندہ پھر کسی موقع پر ہو گی۔

© rasailojaraid.com